غلطیوں نے پیدا کیا ہے۔ لیکن انتہائی پرامن مدرسہ بھی جدیدیت سے نفرت اور قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت اور قدیم روایات سے ہم آہنگی سکھاتا ہے۔ مسلم دنیا مغرب کے اتحادی امیروں اور طاقتوروں اور غریب عوام کے درمیان بٹی ہوئی ہے جو مناسب روز گار کی عدم دستیابی کی صورت میں مذہب کی طرف آ جاتے ہیں۔ یہ سماجی حقیقت اس بات کو مشکل بنا دیتی ہے کہ گزشتہ دو عشروں سے متعارف کروائے گئے جہاد کے ختم ہو جانے کے باوجود بھی مدرسہ انتہا پسندانہ نظریات سے غیر متاثر رہے۔ فنڈ کو منقطع کروا دینا معاون ثابت ہوسکتا ہے مگر اپنے کم اخراجات کی وجہ سے مدرسہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے تعاون کے بغیر بھی باقی رہ سکتا ہے۔

جمہوریت کے ذریعے سیکولر حکومت کو جائز قرار دلوانا بھی مدرسے کے سیاسی اثر کو کم کرسکتا ہے۔ لیکن اس اثر کے تدریجاً کم ہونے کی امید نہیں لگائی جاسکتی جب تک مدرسہ دینی طبقے کا گھر رہے گا جو غریب مسلمانوں میں مقبول ہے۔ جدیدیت کے ثمرات اسی صورت میں پھیل سکتے ہیں جب مسلم دنیا میں دُہرا نظامِ تعلیم ختم ہو جائے۔

مسلم ریاستیں مالی مدد کے ذریعے مدرسوں کی اصلاح کے لیے اب مغربی حکومتوں کو دعوت دے رہی ہیں۔ اصلاح کے لیے مجوزہ ہدایات میں مدرسہ کے نصاب میں روایتی علوم کے ساتھ ساتھ عصری مضامین کا اضافہ بھی ہے۔ لیکن مدرسہ غالباً اصلاحات کی ان کوششوں کو برداشت کرلے بالکل ایسے جیسے نوآبادیاتی دورِ حکومت میں مغربی تعلیم کے تعارف کو اس نے جذب کرلیا تھا۔ مثلاً کیا سائنس اور ریاضی سیکھنا دینیات کے پروان چڑھائے تصورِ دنیا کو بدل سکتا ہے؟ میں نے طاہر سے پوچھا کیا اسے ریاضی سیکھنے میں دلچسپی ہے؟ اس نے کہا: حدیث میں کئی حوالے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جہاد کا ثواب کئی گنا بڑھا کر دے گا۔ اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ ضرب کیسے دی جاتی ہے تو میں اس ثواب کو جمع کر کے معلوم کرسکوں گا جو مجھے قیامت کے دن ملے گا۔

[حسین حقانی پاکستانی کالم نگار ہیں جو امریکی ادارے کارنیگی انڈومنٹ فار انٹرنیشنل پیس میں وزٹنگ اسکالر کے طور پر بھی کام کرتے ہیں۔]

مسلم انتہا پسند حمایت کیسے حاصل کرتے ہیں

تحریر: جوڈی برسلوو

ترجمہ: نثار احمد باجوہ

رپورٹ کے بارے میں:

زیرنظر رپورٹ امریکی ادارہ برائے امن (United States Institute of Peace) میں اپریل میں ہونے والے مباحث اور بریفنگز پر مشتمل ہے۔ ان میں مصطفیٰ کمال پاشا (امریکن یونیورسٹی)، جیسیکا سٹرن (ہارورڈ یونیورسٹی) اور محمد مصلح (لانگ آئی لینڈ یونیورسٹی) نے بطور خاص اپنے تحقیقی پراجیکٹ (گرانٹ فنڈڈ) کے نتائج سے آگاہ کیا۔ اس رپورٹ کو ادارے کے ڈائریکٹر جوڈی برسلوو نے تحریر کیا ہے۔ رپورٹ کے حاشیے میں درج ہے کہ اس کے مندرجات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں کیونکہ ادارہ کسی خاص پالیسی کو سپورٹ نہیں کرتا۔

مختصراً:

- اسلامی دنیا میں مذہبی انتہا پسند گروہ نظریاتی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر منقسم ہیں۔ اسلام کے بارے میں یہ تصور کہ یہ ایک ایسا یک رنگ مذہب ہے جو تشدد کی طرف میلان رکھتا ہے، اس حقیقت کی روشنی میں کہ اکثر مسلمان امن پسند ہیں، منصفانہ نہیں ہے۔ ایسے روایتی تصورات (stercotypes) میں ان اسلامی گروہوں کی ساخت اور انداز میں موجود تنوع اور پیچیدگی کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو ایک سیاسی حکمت عملی کے طور پر تشدد کا انتخاب کرتے ہیں۔
- جنوبی ایشیاء اور مشرق وسطیٰ میں مذہبی انتہا پسندی میں اضافے کے چار بنیادی اسباب یا عوامل

---

* Judy Barsalou, "Islamic Extremists: How do they Mobilize Support?", Special Report, United States Institute of Peace, 1200, 171p Street NW.Washington, DC, (www.USIP.org) July 2002.

ہیں: (۱) اکثر مسلم دنیا میں جمہوری اور جوابدہ حکومتیں نہیں ہیں اور بالواسطہ اسی سے متعلق علاقائی تنازعات، (۲) چند اسلامی ممالک میں گزشتہ صدی میں سماجی، معاشی اور آبادی کی بنیاد پر آنے والی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والے مسائل حل کرنے میں حکومتیں ناکام رہی ہیں، (۳) بیرونی حلقوں سے [اسلامی ممالک کو] دی جانے والی مالی، انتظامی اور اخلاقی امداد اور (۴) خود اسلام میں اجتہاد کے ادارے کا ٹوٹ جانا -- وہ مضبوط روایت جس کے تحت مذہبی علماء متنوع اور تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں قرآنی قوانین کی تطبیق کے لیے قرآن کی آزادانہ تشریح کرتے ہیں۔

● مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی ایشیاء میں ان انتہا پسند گروہوں کی کارروائیوں کے محرکات اور طریقہ کار میں فرق ہے، جس سے ان مختلف اور متنوع حالات کا اندازہ ہوتا ہے جن میں یہ لوگ پروان چڑھتے اور کارروائی کرتے ہیں۔

انفرادی طور پر مختلف خواہشات کی بنا پر ان گروہوں میں شمولیت اختیار کی جاتی ہے جن میں سیاسی اور مالی مقاصد کو حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ رومانی اور جذباتی تسکین بھی شامل ہے۔ یہ گروہ ایسے افراد کے لیے بھی بڑی کشش رکھتے ہیں جو خواہ کوئی بھی سماجی یا مالی حیثیت رکھتے ہوں لیکن وہ محسوس کریں کہ ان کے ساتھ حکومت کی طرف سے یا کسی بااثر کی طرف سے زیادتی کی گئی اور انہیں دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے۔

● کامیاب انتہا پسند گروہوں کا مشن بڑا واضح ہوتا ہے۔ ان کے ہاں کام کی تقسیم اس طرح سے ہے کہ مقابلتاً نوجوان، ان پڑھ ''پیادہ سپاہی'' زیادہ مشقت کا کام کرتے ہیں اور اچھے پڑھے لکھے افراد کارروائی کرتے ہیں اور فنڈ اکٹھا کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ اکثر گروہ فنڈ ز جمع کرنے کے لیے بہت حد تک انٹرنیٹ پر انحصار کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بیرونی حکومتوں سے بھی امداد حاصل کرتے ہیں۔

● اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ان گروہوں کی صلاحیت کا انحصار مزید چار عوامل پر ہے:

ہتھیاروں کا حصول: تعلقات عامہ کے فن میں مہارت، اپنے مقاصد کے لیے میڈیا کو استعمال کرنا، انٹیلی جنس کے ذرائع تک رسائی اور جوابی انٹیلی جنس کی مہارتیں، اور اپنے کارپوریٹ ہیڈکوارٹر کا

قیام—یا تو کسی علاقے میں باقاعدہ یا انٹرنیٹ کے ذریعے فاصلاتی ہیڈ کوارٹر۔

● پاکستان میں تمام اسلامی مدرسے دہشت گردی کی تربیت نہیں دیتے جیسا کہ مغربی پریس میں عام طور پر انہیں پیش کیا جاتا ہے۔ بہت سے قدیم مذہبی مدرسے تعلیم کی مستحکم روایات کے مرکز ہیں، جہاں سے بڑے بڑے مسلم دانشور پیدا ہوئے ہیں۔ جبکہ دیگر مدرسے تعلیم کے ساتھ دوسری سماجی خدمات سرانجام دیتے ہیں جو کہ حکومت کی طرف سے فراہم نہیں کی جاتیں۔ اسی طرح بہت سے سکول مثلاً لبنان میں، فلسطینی علاقوں میں، مصر میں، نوجوانوں کو عسکریت پسندی کے بجائے روایتی مذہبی اقدار کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کا عسکریت کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کے پس پردہ عوامل

مصطفیٰ کمال پاشا نے اسلام اور مذہبی انتہا پسندی کے بارے میں چند عمومی مشاہدات سے گفتگو کا آغاز کیا۔ دنیا بھر میں اور پاکستان میں مسلمان فرقہ وارانہ اور نظریاتی بنیادوں پر تقسیم کا شکار ہیں۔ اس گروہ بندی کو نظر انداز کرتے ہوئے اکثر مبصرین اسلام کو اچھے اور بُرے، آزاد خیال اور تنگ نظر، منطقی اور رجعت پسند کے خانوں میں تقسیم کرکے دیکھتے ہیں۔ جس سے صورت حال کو سمجھنے میں مزید مشکل پیش آتی ہے۔ پاشا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ''دہشت گردی'' روزمرہ کی گفتگو میں بڑی روانی سے استعمال ہونے والی اصطلاح بن گئی ہے۔ وہ تجویز کرتے ہیں کہ اس کے بجائے اسلامی دہشت گردوں کے تعارف کے لیے کسی بہتر راستے کی تلاش کرنی ہوگی اور دہشت گردی کو بذاتِ خود ایک مظہر کے طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ پاشا کا اصرار ہے کہ دہشت گردی جارحانہ سرگرمی کی ایک مخصوص شکل ہے اور اسے آسانی سے مذہب کا نتیجہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عام طور پر دہشت گرد مخصوص مذہبی نظریات سے جواز تلاش کرتے ہیں۔ اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح عام طور پر اس طرح پیش کی جاتی ہے، جیسے اس کی کوئی دوسری وجہ نہ ہو اور اس سے اسلام کی رواجی تصویر کشی کو مزید تقویت ملتی ہے۔

پاشا پاکستان میں پرانے اور نئے اسلام پسندوں میں واضح فرق محسوس کرتے ہیں۔ جدید اسلام پسند عموماً سیاسی اسلام کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ مذہب میں سیاست کے ذریعے اور سیاست میں مذہب

کے ذریعے اصلاح چاہتے ہیں۔ جبکہ پرانے اسلام پسند سیکولر سیاسی نظام میں مذہبی آزادی کے ساتھ پُرامن طور پر مل کر رہنا چاہتے تھے۔ جبکہ نئے لوگ ایسے کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اکثر وہ یہ فن سیاست سیکولر جدت پسندوں سے سیکھتے ہیں، خاص طور پر اخبار اور ٹی وی کی صحافت کا اپنے مقصد کے لیے استعمال۔ نئے اسلام پسند ریاست اور معاشرے دونوں کو اپنے ان نظریات کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں جنہیں وہ حقیقی اسلامی نظام کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

پاشا کے خیال میں نئے اسلام پسند ۱۹۷۱ء کی بنگلہ دیش کی جنگ، عرب اسرائیل کی ۱۹۷۳ء کی جنگ اور پھر تیل کی بندش سے پیدا ہونے والی صورت حال سے ابھرے ہیں۔ تیل کی معیشت سے عرب ممالک میں آنے والی خوشحالی کے نتیجے میں ۷۰ کی دہائی میں جنوبی ایشیاء سے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد (جن میں پاکستان کے بہترین کارکن شامل تھے) خلیج کے ملکوں میں چلی آئی، جس نے پاکستان میں مزدور تحریک کو کمزور کر دیا۔ بعض پرانے اسلام پسند نئے اسلام پسند بن گئے۔ ان میں جماعت اسلامی کا گروہ بھی شامل تھا جس نے ابتداء میں امریکہ کی حمایت کی لیکن بعدازاں اس کے مخالف ہو گئے۔ لیکن لیکن بہت سے اسلام پسند افغانستان میں سوویت روس کے خلاف جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مخصوص حالات اور سیاسی فرقہ وارانہ تقسیم سے ابھر کر سامنے آئے۔

نئے اسلام پسند جدید زندگی کے سائنسی اور فنی تقاضوں سے بہتر طور پر آشنا ہیں اور وہ ان کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے ہیں مگر جدید ثقافت کو یکسر مسترد کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ پرانے اسلام پسندوں کے برعکس یہ لوگ روایتی سیاسی اداروں کے ذریعے حمایت حاصل کرنے کی بجائے جدید عوامی میڈیا پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ تاہم جہاں تک عمومی حمایت کا تعلق ہے تو وہ نئے اسلام پسندوں کے لیے بہت ہی مختصر ہے، ووٹوں کا محض پانچ فیصد اور ان کا گروہ بہت ہی چھوٹا ہے۔

پاکستان میں نئے اسلام پسندوں کی حکمت عملی یہ ہے کہ پہلے معاشرتی اداروں پر کنٹرول حاصل کیا جائے، جیسا کہ تعلیمی ادارے اور میڈیا اور پھر ان کی قوت سے ریاست پر کنٹرول کیا جائے۔ ایسی حکمت عملی یہ ظاہر کرتی ہے کہ پاکستانی ریاست اور سیکولر اشرافیہ دونوں نازک اور کمزور ہیں۔ اپنے وسائل کو فوجی اخراجات اور قرضوں کی واپسی پر خرچ کر دینے والی مطلق العنان پاکستانی ریاست انتہائی غریب لوگوں کو

زندگی کی بنیادی سہولتیں مہیا کرنے میں بھی ناکام ثابت ہوئی ہے۔ بلاشبہ، پاشا کی دلیل ہے کہ پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کے عروج کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کی ریاست ترقیاتی خدمات میں زوال کا شکار ہے۔

مندرجہ بالا حکمت عملی کی بدولت جدید اسلام پسندوں نے سیاسی جدوجہد کو اسلامی شکل دے کر ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے، جس نے سیکولر عناصر کی سیاسی جدوجہد کو بہت کمزور کر دیا ہے۔ درحقیقت اُنہوں نے ۱۹۷۹ء کے آخر میں افغانستان میں سوویت روس کے خلاف جنگ کے نتیجے میں بننے والے انتہا پسند مذہبی مدرسوں کے اثر سے بہت پہلے پاکستان میں سیاسی عمل کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ سیکولر حکمرانوں نے اپنی قوت کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے پروپیگنڈے میں اسلامی اصطلاحات کا استعمال شروع کر دیا تھا جس سے نئے اسلام پسندوں کی حمایت کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ جدید اسلام پسند اب پاکستان میں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھی چھائے ہوئے ہیں۔

میڈیا نے اس عمل میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ انتہا پسند گروپوں نے اردو زبان میں شائع ہونے والے اخبارات وجرائد سے بھرپور قوت حاصل کی ہے۔ تاہم انگریزی میڈیا میں بھی ان کی حمایت موجود ہے۔ انتہا پسند گروپوں نے اپنی کوششوں سے شراب کے استعمال پر پابندی لگوا کر ایک اہم کامیابی حاصل کی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کو گھروں تک محدود کر دیا ہے جہاں مردوں کی اجارہ داری قائم ہے۔

پاکستان میں مذہبی مدرسوں کی بحث پر واپس آتے ہوئے پاشا نے دلائل دیے کہ اکثر اوقات ان کو بڑی سادگی سے دہشت گردوں کی فیکٹریاں کہہ دیا جاتا ہے۔ درحقیقت مدرسوں کی تین بڑی اقسام ہیں۔ پہلی قسم میں وہ قدیم روایتی مدرسے ہیں جنہوں نے سنجیدہ اور جلیل القدر علماء پیدا کیے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ مدارس آتے ہیں جو معاشرے کے انتہائی غریب طبقوں کی تعلیمی اور سماجی بہبود کے لیے خدمات انجام دیتے ہیں جنہیں پاکستانی حکومت مناسب طور پر پورا نہیں کر رہی۔ صرف تیسری قسم کے مدرسے ایسے ہیں، جن میں سے زیادہ تر افغانستان میں روس کے خلاف ہونے والی جنگ کے دوران بنائے گئے تھے۔ ان کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عسکریت پسند جہادی پیدا کر رہے ہیں۔

ان تیسری قسم کے مدارس میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ پاشا کے بقول ان کو انتہا پسند دانشور چلاتے ہیں جو زیادہ تر قدامت پرست وہابی خیالات کے مطابق اسلام کی تشریح کرتے ہیں۔ خاص طور پر عورت کے مقام/کردار کے بارے میں یہ بہت تنگ نظر ہیں۔ پاشا کے مطابق ان میں سے اکثر افراد اور انتہا پسند اسلامی گروہوں کے کئی قائدین سائنسی علوم سے بہرہ مند ہیں لیکن مغربی ثقافت کے بارے میں وہ کم ہی جانتے ہیں سوائے اس کے کہ اس کی پیدا کردہ ٹیکنالوجی کو کیسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

خود اپنے مدرسے/اسکول قائم کرتے ہوئے ان انتہا پسند دانشوروں نے پاکستان کے ان بہترین تربیت یافتہ افراد کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جنہوں نے ستر اور اسی کی دہائی میں اچھی ملازمتوں کے لیے خلیج کا رُخ کیا تھا۔ اُنہوں نے افغانستان میں روسی حملے کے جواب میں ہتھیاروں کی بہتات اور غیر ملکی امداد (خصوصاً سعودی عرب اور امریکہ کی طرف سے) کے نتیجے میں جنم لینے والے کلاشنکوف کلچر سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔

وسیع معنوں میں پاکستان میں انتہا پسند مدارس اور مذہبی انتہا پسندی سے ''اجتہاد'' کی ناکامی کا اظہار ہوتا ہے ـــــ اجتہاد ایک مسلمہ روایت ہے جس کے تحت مذہبی علماء متنوع اور تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں قرآنی قوانین کی تطبیق کے لیے قرآن کی آزادانہ تشریح کرتے ہیں۔ اگرچہ ابتدائی صدیوں میں [مسلم معاشروں میں] داخلی سطح پر زندہ مباحث کے لیے جگہ تھی لیکن آج ان کے ہاں علمی مدافعت کا انداز نمایاں ہے۔ اس کا اظہار انتہا پسند مدارس کے ذریعے ہوتا ہے جن کا رجحان غیر علمی نظریہ پرستی کی طرف ہے۔ ان مدارس کے قیام سے ان مایوسیوں کا اظہار بھی ہوتا ہے جو پاکستان میں گلوبلائزڈ عالمی معیشت سے فائدہ اٹھانے والی مسلم اشرافیہ اور غریبوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج سے پیدا ہوئی ہیں۔

جنوبی ایشیاء میں تنظیمی اور تحریکی حکمت عملیاں

جیسیکا سٹرن نے بحث کا رُخ موڑتے ہوئے دو موضوعات پر توجہ دی۔ جہادی تنظیموں میں افراد کی شمولیت کے بنیادی محرکات کیا ہیں؟ اور جہادی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے کیا تنظیمی حکمت عملیاں

اپنائی جاتی ہیں؟ اس کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا میں مختلف عقیدے رکھنے والے انتہا پسندوں میں کچھ قدریں مشترک ہوتی ہیں۔

سٹرن کے مطابق مختلف وجوہات کی بناء پر افراد انتہا پسند گروہوں میں شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔ ان میں ایک وجہ مخصوص سیاسی مفادات کا حصول ہے جیسے کسی متنازعہ علاقہ پر حکومت حاصل کرنا۔ جذباتی محرکات بھی ان میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

انتہا پسند گروپوں کے ارکان اکثر یہ کہتے ہیں کہ ''شہرت'' کے شوق میں وہ ان میں شامل ہو جاتے ہیں اور پھر بعد میں وہ ایسی پر جوش سرگرمیوں کے عادی ہو جاتے ہیں جو کہ ان کے لیے ایک طرز زندگی بن جاتی ہیں۔ نچلے طبقے کے گمنام نوجوان اپنے عسکری کارناموں کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں جب ہزاروں لوگ ان کے جنازے میں شرکت کرتے ہیں۔ ان گروہوں کے ارکان اپنے دوستوں کو بھی سرگرمی سے ان گروہوں میں بھرتی کراتے ہیں۔ لیکن سٹرن زور دیتی ہیں کہ جہادی عسکریت پسندوں میں سب سے عمومی جذباتی محرک یہ ہوتا ہے کہ وہ، اپنے رتبے سے قطع نظر، محسوس کرتے ہیں کہ حکومتی حکام یا دوسروں نے کبھی ان کی توہین اور تحقیر کی ہے۔ حتیٰ کہ یہ احساس ان جہادی افراد میں بھی پایا جاتا ہے جو نسبتاً امیر ملکوں سے ہوتے ہیں یا جن کا پس منظر امیرانہ ہوتا ہے۔

روحانی محرکات بھی ان گروہوں میں شمولیت کا سبب بنتے ہیں۔ انتہا پسند گروہوں کے راہنما اکثر سیاسی، معاشرتی اور معاشی محرومیوں کی بات روحانی اصطلاحوں میں کرتے ہیں۔ بعض اپنے کارکنوں کو ابتداء سے ہی ''حقیقی زندگی''، یعنی آخرت کے بعد کی زندگی پر توجہ دینے کی تربیت دیتے ہیں اور گروپ میں شمولیت کے اس روحانی فائدے کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان میں لشکر طیبہ کے سربراہ حافظ سعید کا حوالہ دیتے ہوئے جیسیکا سٹرن کہتی ہیں کہ یہ گروپ آٹھ سال کی عمر کے بچوں کو بھرتی کرنا پسند کرتا ہے تا کہ انہیں قربانی کی روح کو سمجھنے کی تربیت دی جا سکے۔

مالی فوائد بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ کامیاب گروپ اپنے ارکان کو بھاری معاوضہ دیتے ہیں اور اکثر ارکان معاوضے کو ترغیب دینے کے لیے بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر پاکستان میں موجود حرکت المجاہدین کے ایک رکن نے بیان کیا کہ اگر وہ باقاعدہ ملازمت کے لیے گروپ کو چھوڑ دے تو اس کی

تنخواہ میں خاصی کمی ہو جائے گی۔ لشکر طیبہ کے ایک درمیانی درجے کے منیجر نے بتایا کہ زندگی میں عام کاروبار کی نسبت اس کی آمدنی سات گنا زیادہ ہے۔ اسی طرح قائدین کہیں زیادہ کماتے ہیں۔ شہیدوں کے خاندان کو معقول معاوضہ ملتا ہے یا انہیں رہائش کے لیے بہتر گھر دیے جاتے ہیں۔ گروپ کے راہنما اکثر معاوضے میں اضافے کے لیے موقع پرستی کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ سٹرن نے بتایا کہ تنزانیہ اور سوڈان میں امریکی سفارت خانوں میں حملہ آور القاعدہ کے ارکان سے مقدمے کی کارروائی کے دوران معلوم ہوا کہ القاعدہ کے ایک سوڈانی رکن جمال الفضل نے اس وقت سخت غصے کا اظہار کیا جب اسے معلوم ہوا کہ اس کے ہم منصب مصری اس سے تین گنا زیادہ معاوضہ لیتے ہیں۔ الفضل کے مطابق اسامہ کا ردِعمل یہ تھا کہ مصریوں کو سفر اور دوسرے روزگار کے بہتر مواقع میسر ہیں۔

سٹرن نے جنوبی ایشیا میں کامیاب انتہا پسند تنظیموں کی چند تنظیمی ضروریات کے بارے میں بھی بتایا۔ سب سے پہلے وہ ایک ''مشن سٹیٹ منٹ'' میں اپنے مقاصد کو واضح کرتے ہیں۔ چند ایک، مثلاً القاعدہ، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قائل یا متاثر کرنے کے لیے اپنے اس مقصدیت کے بیان کو تبدیل کر سکتی ہے — جیسا کہ حال ہی میں اسامہ بن لادن نے بیان دیتے ہوئے عرب اسرائیل تنازعہ اور مسئلہ کشمیر پر اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے کیا۔

ان گروہوں کو ہتھیاروں کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اکثر یہ ہتھیار بلیک مارکیٹ سے یا پھر زیر زمین مافیا سے اپنے رابطوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک پاکستانی مخبر نے بتایا کہ وہ لوگ پچاس فیصد ہتھیار بھارت میں جرائم کے منظّم گروہوں سے یا پھر بھارتی فوجی اہلکاروں سے حاصل کرتے ہیں۔

دیگر تنظیموں کی طرح انتہا پسند مذہبی تنظیمیں بھی کام کی تقسیم پر انحصار کرتی ہیں۔ مثلاً نوجوان پیادہ سپاہیوں اور بہتر تعلیم یافتہ کارکنوں کی کارروائیوں کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے۔ پاکستان میں اول الذکر مدرسوں سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا میں لشکر جہاد نوجوان یونیورسٹی طلبہ کو بھرتی کرتا ہے۔ جب مصری گروپ ''اسلامی جہاد'' القاعدہ میں مدغم ہو گیا تو اسامہ بن لادن کو افسروں کی ایک تیار فوج مل گئی۔

چندہ اکٹھا کرنا ان گروہوں کی کامیابی کے لیے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے لیے یہ لوگ

مختلف حکمت عملیاں اختیار کرتے ہیں۔ چند ایک مثلاً لشکر جہاد، جس کی اپنی ایک بڑی عمدہ ویب سائٹ ہے، اپنا زیادہ تر چندہ انٹرنیٹ کے ذریعے اکٹھا کرتی ہے۔ بعض تنظیموں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ اس کام کے لیے افغانستان سے منشیات سمگل کرتی ہیں۔ بعض گروپ اپنے زخمی ساتھیوں کو نماز جمعہ کے اجتماعات میں بھیج کر چندہ اکٹھا کرتے ہیں۔ جبکہ بعض گروپوں کے افراد، جن میں انڈونیشیا کی تنظیم لشکر جہاد بھی شامل ہے، چندہ اکٹھا کرنے کے لیے جکارتہ کی گلیوں میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اس حکمت عملی کا بڑا مقصد چندہ اکٹھا کرنے سے زیادہ تعلقات عامہ کو فروغ دینا ہے تاکہ کمیونٹی میں اپنی حیثیت کو مستحکم کیا جا سکے۔ زیادہ تر تنظیموں نے بتایا کہ ان کے بجٹ کا بہت کم حصہ عوامی چندے سے میسر آتا ہے۔

بیرونی ممالک سے چندہ بھی ان گروہوں کی امداد کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ مثال کے طور پر حرکت المجاہدین کے ایک مخبر نے بتایا کہ ان کے فنڈز کا ساٹھ فیصد بیرونی ممالک سے آتا ہے مثلاً حج کے موقع پر تقریروں کے ذریعے اور بہت سے عرب امراء بھی عطیات دیتے ہیں۔ ماضی میں سعودی حکومت بھی جنوبی ایشیا میں ان گروہوں کی مالی امداد کا ایک بڑا ذریعہ تھی۔

جاسوسی اور مخالفانہ جاسوسی کے مشن بھی ان انتہا پسند تنظیموں کی کارروائیوں کے لیے خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ سٹرن نے بتایا کہ یہ گروپ خفیہ معلومات بھارتی جاسوسی تنظیم ''را'' (Research and Analysis Wing) کے ایجنٹوں سے خرید لیتے ہیں۔ القاعدہ سے چھینے گئے ایک تربیتی نصاب سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے نمائندوں کو دشمن کے علاقے میں حملہ کرنے اور غائب ہو جانے کی بڑی اعلیٰ تربیت فراہم کی جاتی ہے۔

سٹرن نے یہ بھی کہا کہ جن گروہوں سے اس نے انٹرویو کیا ان سے پتہ چلا کہ پاکستانی جاسوسی تنظیم آئی ایس آئی بھی ان کو مدد فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ گیارہ ستمبر کو امریکہ پر دہشت گردی کے بعد آئی ایس آئی کی قیادت کو تبدیل کر دیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود ابھی تک آئی ایس آئی میں ان انتہا پسند گروہوں کے لیے ہمدردیاں موجود ہیں۔

عوامی سطح پر اچھے تعلقات ان تنظیموں کی کامیابی کے لیے کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ حمایت حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ ابلاغ عامہ کو بھی ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سٹرن نے مثال کے

طور پر واضح کیا کہ ایک پاکستانی گروپ نے سٹرن کی کانگریس میں گواہی کو اپنے اخبار میں نمایاں جگہ دی اگرچہ اُس نے اِس گروپ کو دہشت گرد قرار دیا تھا۔

انتہا پسندوں کو ایک ہیڈ کوارٹر کی بھی ضرورت ہوتی ہے جہاں وہ اپنی کارروائیوں کی منصوبہ بندی کر سکیں۔ ابھی تک تو افغانستان کی ناکام ریاست القاعدہ کو جگہ فراہم کرتی تھی لیکن جب ان مقامات کو ان گروپوں کے لیے بند کر دیا گیا تو وہ بعض اوقات کسی قائد کے بغیر ''نیٹ ورکس کا نیٹ ورک'' تشکیل دیتے ہیں اور اسے انٹرنیٹ کے ذریعے منظم کرتے ہیں۔

سٹرن نے یہ بھی بتایا کہ ان گروہوں کو قابو کرنے میں پاکستانی حکومت تقریباً ناکام ہوئی ہے۔ ماضی قریب میں حکومت نے تقریباً دو ہزار افراد کو گرفتار کیا لیکن صرف چند ایک پر فرد جرم عائد کی جا سکی۔ حکومت صرف اس وقت ان کے بنک اکاؤنٹ منجمد کر سکی جب یہ اپنے اکاؤنٹس میں سے فنڈ منتقل کر چکے تھے۔ بعض راہنما زیر زمین چلے گئے لیکن اتنے اوجھل نہیں تھے کہ سٹرن ان سے رابطہ نہ کر سکتی۔ بیرونی قوتوں کے دباؤ کی بدولت اور اندرونی اختلافات کی وجہ سے یہ گروپ اکثر بکھر کر پھر منظم ہو جاتے ہیں اور ان پر قابو پانا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔

مصر، لبنان اور فلسطینی علاقوں میں انتہا پسند گروپ

مشرق وسطیٰ پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے محمد مصلح نے زور دیا کہ مختلف گروہوں کا نظریہ، ایجنڈا اور بھرتی کا طریقہ وقت اور ماحول کے مطابق وقتاً فوقتاً بدلتا رہا ہے۔ لیکن پوری عرب دنیا میں دہشت گردی کا اہم ترین سبب حکومتوں کی طرف سے ہونے والا ظلم و جبر ہے یا پھر لبنان اور فلسطینی علاقوں پر غیر ملکی قبضہ ہے۔

مصلح نے تجویز پیش کی کہ مسلم دنیا میں اول الذکر مسئلے کا بہترین حل مسلم ممالک میں جمہوری اور جوابدہ حکومتوں کی تشکیل ہے۔ ایسی حکومتوں کے قیام سے انتہا پسند گروہوں کی کشش اور اپیل میں کمی آ جائے گی اور انہیں تشدد سے باز رکھنے میں مدد ملے گی۔ مصر کے الجماعۃ الاسلامیۃ (اسلامی جماعت) کے راہنما نے اس مؤقف کی تائید کی ہے۔ قاہرہ سے چھپنے والے اخبار ''الاحرام الدولیہ'' کی فروری - مارچ

۲۰۰۲ء کی اشاعتوں میں اس گروہ کے لیڈر کے بیانات کے محتاط مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۸۰ءاور ۱۹۹۰ء کے عشروں میں اس گروپ کو تشدد کی طرف لانے میں ریاستی ظلم و جبر نے کیا کردار ادا کیا تھا۔ جبکہ ثانی الذکر مسئلے (لبنان اور فلسطینی علاقوں میں دہشت گردی) کا واحد حل محمد مصلح کے خیال میں یہی ہے کہ لبنانی اور فلسطینی علاقوں سے غیر ملکی قبضہ ختم کر دیا جائے۔

مصلح کے مطابق اس پورے خطے میں تمام انتہا پسند گروپ مصر کے شہر اسماعیلیہ میں ۱۹۲۸ء میں حسن البناء کی قائم کردہ تنظیم اخوان المسلمون سے متاثر ہیں۔ حسن البناء کی تحریریں، خاص طور پر اس کے خطوط اور تقاریر ـــــ دعوتنا فی القارین (نئے دور میں ہماری دعوت) اور ''رسائل الشہید حسن البناء'' اس ضمن میں خصوصاً قابل ذکر ہیں ـــــ اسلامی مفکروں اور کارکنوں کے لیے ایک معیاری حوالے کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح سیّد قطب کی تحریریں خاص طور پر ان کی سات جلدوں میں قرآن کی انقلابی تفسیر (فی ظلالِ القرآن) اور معالم فی الطریق (نشانِ منزل) کے اثرات شدت پسند مسلمانوں پر اور بھی گہرے ہیں۔ اس کے علاوہ خالد محمد خالد کی ابتدائی تحریریں جو کہ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں لکھی گئیں، خاص طور پر ''من ھنا ---نبدأ'' (ہم یہاں سے آغاز کرتے ہیں) نے ان تحریکوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

مصلح نے اس بات پر زور دیا کہ بنیادی طور پر حسن البناء نے مصری ریاست کی قانونی حیثیت کو تسلیم کر لیا تھا اور وہ برطانیہ کی نوآبادیاتی انتظامیہ کے ساتھ بات چیت کے حامی تھے اور اُنہوں نے حکومت کے ساتھ پُرامن طور پر رہنے سے اتفاق کر لیا تھا، اگرچہ وہ حکومت اسلامی اصولوں پر قائم نہیں ہوئی تھی۔ لیکن جب سیّد قطب اور دیگر مصری اسلام پسند راہنماؤں کو مصری جیلوں میں تشدد کا نشانہ بنایا گیا تو اُنہوں نے سیاسی حکمت عملی کے طور پر تشدد کا راستہ اختیار کرنے کی حمایت شروع کر دی۔ مصلح نے دلیل دی کہ اس طرح تشدد، ظلم و جبر اور شہری حقوق کی خلاف ورزیاں اسلام پسندوں کو سیاسی عمل سے انتہا پسندی کی طرف لانے کا ایک اہم سبب ہیں۔ مصر سے تعلق رکھنے والے القاعدہ کے اہم راہنما ایمن الظواہری کے بیانات سے اشارہ ملتا ہے کہ مسلمان کارکنوں پر مصری جیلوں میں بہت زیادہ تشدد کیا گیا جس سے یہ لوگ بہت رنجیدہ ہوئے اور اُنہوں نے تشدد کے ذریعے اس کا بدلہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ یہ لوگ نہ صرف مصری ریاست کے خلاف تھے بلکہ اس کے اہم مددگار امریکہ کے بھی خلاف ہو گئے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ''مصلح کے خیال'' میں اخوان المسلمون نے بہت سی بکھری ہوئی ذیلی تنظیموں اورگروہوں کوجنم دیا۔ان میں سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پیدا ہونے والے گروہوں کا ذکر ضروری ہے: النجو نا من النار (وہ جو جہنم کی آگ سے بچا لیے گئے)، الجماعۃ الاسلامیہ التکفیر والجحرہ اور تنظیم الفقیہ العسکریہ۔ تاہم اخوان المسلمون کی زیادہ تر مرکزی توجہ سماجی نوعیت کے داخلی مسائل پر رہی (مثلاً خواتین کا لباس اور کردار) اور اسلامی ریاست میں حکومت کا سوال۔

مصلح کے مطابق اس مرکزی تنظیم نے مصر میں سیکولر اور بائیں بازو کی جماعتوں کے ساتھ سیاسی اتحاد کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ایک بڑا ذیلی گروپ الجہاد الاسلامی ۱۹۹۰ء کے وسط میں مزید دو گروپوں میں تقسیم ہوگیا۔ایک گروپ مصر سے باہر نکل کر القاعدہ میں شامل ہوگیا اور دوسرا ابھی تک مصر میں موجود ہے۔ ۱۹۹۵ء میں مصر کے اسلامی جہاد گروپ نے، جو مصر سے باہر تھا، عرب دنیا کے ''مرتد'' حکمرانوں اور افراد کے خلاف جنگ کی بجائے اپنا رخ امریکیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف موڑ لیا۔ ان چند گروپوں میں سے جنہوں نے اسلامی ریاست کے قیام کا ایک تفصیلی منصوبہ بنایا ایک گروپ کا نام حزب التحریر الاسلامی ہے۔ شیخ تقی الدین النبھانی نے اس گروہ کی بنیاد ۱۹۵۲ء میں یروشلم میں رکھی۔اس میں زیادہ تر تاجر اور درمیانے طبقے کے افراد شامل ہوتے ہیں۔

لبنان اور فلسطینی مقبوضہ علاقوں کے حالات میں بڑا فرق ہے اور یہ فرق مصلح کے مطابق ان گروہوں میں بھی بڑا واضح ہے۔لبنان میں حزب اللہ (جو اسلامی جہاد کہلاتا ہے) شروع شروع میں شیعہ فرقہ کی معاشرتی اور سیاسی محرومیوں اور ایران میں کامیاب اسلامی انقلاب کی وجہ سے ابھرا۔ ۱۹۸۹ء میں آیت اللہ خمینی کی وفات تک تو اس گروہ کا مقصد لبنان میں اسلامی حکومت کا قیام تھا۔اس کے بعد اس کے مقاصد میں تبدیلی آ گئی اور اس نے فلسطینی گروہوں حماس اور فلسطینی اسلامک جہاد کی طرح قومی جدوجہد آزادی کے مقصد کو اپنا لیا۔ان کا مقصد جنگ کے ذریعے لبنان سے اسرائیل کے قبضہ کو ختم کروانا تھا اور موقع ملنے پر ممکنہ طریقے سے یہ گروہ فلسطینی انتفادہ کی امداد بھی کرتا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں اس گروہ نے کثیر الثقافت اور کثیر النسل لبنانی ریاست کے قانونی جواز کو تسلیم کر لیا اور خود کو ایک سیاسی جماعت میں تبدیل کر لیا جسے لبنانی پارلیمنٹ میں نمائندگی بھی حاصل ہوگئی۔

مصلح اصرار کرتے ہیں کہ اسرائیل کے ساتھ امن کے سوال پر حزب اللہ اور حماس کے مؤقف میں درجے کا فرق پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے بیانات اور لٹریچر میں حزب اللہ فلسطین کے تمام اصل علاقوں کی آزادی چاہتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شعبا فارمز کا علاقہ، جو اس کا دعویٰ ہے کہ لبنان کی ملکیت ہے اور شام کو گولان کی پہاڑیوں کی واپسی۔ تاہم مصلح کے مطابق حماس کے بارے میں خیال ہے کہ وہ مغربی کنارے اور غزہ میں فلسطینی ریاست کو قبول کرلیں گے جس کا دارالحکومت یروشلم ہو۔ اگرچہ حماس کے نزدیک یہ حل یہودی ریاست کے ساتھ کسی حتمی امن کے بجائے صلح کے لیے ایک عبوری اور عارضی حل ہے۔ حزب اللہ کی طرح فلسطینی اسلامی جہاد بھی فلسطین کی مکمل آزادی کا دعویدار ہے جس میں آج کا اسرائیل اور فلسطینی علاقے شامل ہیں۔

مصلح کے بقول یہ بات اہم ہے کہ شروع میں اخوان المسلمون کی طرح حماس بھی فلسطینی اتھارٹی کے ساتھ مل کر رہنا چاہتی تھی اور کئی مواقع پر اس نے اسرائیل کے ساتھ جنگ بندی (سیز فائر) قبول کر لینے کے لیے بھی بات چیت کی۔ دوسرے الفاظ میں سیّد قطب کے خیال کے برعکس جو مصر اور تمام عرب علاقوں کو دارالحرب قرار دے کر یہاں کی غیر اسلامی حکومتوں کو گرا کر معاشرے کی نئے سرے سے اسلامی اصولوں کے مطابق صورت گری کے خواہاں تھے۔ حماس فلسطینی علاقوں کو دارالحرب قرار نہیں دیتی۔ سیّد قطب نے تحریر کیا تھا کہ قرآن ایک تلوار ہے اور اس کو کافروں کے خلاف دنیا بھر میں ہر محاذ پر جنگ کرنا ہے۔ لیکن حماس کی تحریروں میں ایسی بات نہیں ہے۔ اگرچہ دونوں حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد اسلام کے نام پر کام کرتی ہیں اور اخوان المسلمون سے ہی نکلی ہیں لیکن دونوں تنظیمیں فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کے درمیان قومی جدوجہد پر اور اسرائیلی قبضے سے فلسطینی علاقوں کی آزادی پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔

اس پس منظر میں یہ بات حیران کن نہیں ہے کہ حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد کی تحریریں مذہبی نقطہ نظر سے جہاد کو اس انتہا پسندی سے بیان نہیں کرتیں، جس شدت سے اس کو اخوان المسلمون، حزب اللہ، القاعدہ اور مصری اسلامی جہاد بیان کرتے ہیں۔ مصلح کے بقول اسلامک جہاد اور حماس اسلامی فقہ کی تشریح میں اس طرح سے مصروف نہیں ہیں جیسا کہ سیّد قطب بہت گہرائی میں اسلامی طرز حکومت کے لیے مذہبی نقطہ نظر کا تجزیہ کرتے تھے۔

مصلح کے خیال میں اگرچہ فلسطینی اسلامی جہاد اور حماس کے ایران کے ساتھ بڑے قریبی تعلقات ہیں، لیکن دونوں سنی روایات کے قریب ہیں۔ تاہم نظریاتی اعتبار سے اسلامی جہاد حماس کی نسبت ایران سے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ جب دسمبر ۱۹۹۲ء میں اسرائیل نے حماس کے ۴۰۰ افراد اور ان کے حمائیوں کو جنوبی لبنان کے ایک علاقے ''مرج الزہر'' میں دھکیل دیا تھا تو ایران نے ان کی مالی اور سیاسی امداد کی تھی۔ مجموعی طور پر حماس بنیادی طور پر اخوان المسلمون کے مرجع (حوالہ) کے قریب ہے جبکہ فلسطینی اسلامی جہاد ایران کے ''مرجع'' سے گہرے طور پر متاثر ہے۔ مزید یہ کہ فلسطینی اسلامی جہاد کی نسبت حماس ایران کی شیعہ روایات کی زیادہ ناقد ہے۔

حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد کے مقابلے میں حزب اللہ نظریاتی طور پر ایران سے زیادہ قریب ہے کیونکہ اس کی جڑیں لبنان کی شیعہ آبادی میں ہیں۔ امیر لبنانیوں اور غیر لبنانی شیعہ خاندانوں کے ساتھ ساتھ ایران حزب اللہ کے لیے فنڈز کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ ایران کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حماس اور فلسطینی اسلامی جہاد کو بھی غیر مخصوص/غیر متعین امداد فراہم کرتا ہے۔

مصلح کے خیال میں، حمایت کے حصول کے لیے فلسطینی و لبنانی گروہ میں بہت فرق ہے۔ حزب اللہ ہر سال عاشورہ کے موقع پر لاکھوں لوگوں کے ماتمی جلوس منظم کرتی ہے۔ اور اس موقع کو اپنے حمائتیوں کی تعداد میں اضافے کے لیے استعمال کرتی ہے اور ان کے لیے سماجی خدمات بھی انجام دیتی ہے۔ یہ تنظیم ''المنار'' کے نام سے ایک جدید اور مؤثر ٹی وی اسٹیشن بھی چلاتی ہے۔

مصلح کے مطابق فلسطینی اسلامی جہاد حماس کی نسبت کارکنوں کی بھرتی اور کارروائیوں (آپریشنز) کے لیے بہت خفیہ طریقے اختیار کرتی ہے۔ دونوں فلسطینی تنظیموں کے بیانات کے مطابق ۲۰۰۲ء میں بہت سے فلسطینی شہروں اور قصبوں پر دوبارہ اسرائیلی قبضے کے بعد ان کے پاس خودکش حملوں کے لیے اس قدر زیادہ لوگ انفرادی طور پر رابطہ قائم کرتے ہیں کہ ان کے پاس ہتھیاروں اور تربیت کی اتنی سہولیات/وسائل بھی موجود نہیں ہیں۔

مصلح بیان کرتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں مذہبی مدرسے نوجوانوں کو انتہا پسند مذہبی عقائد سے متعارف کرانے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں لیکن مقابلتاً فلسطینی علاقوں میں ایسے کوئی اسکول نہیں ہیں۔

فلسطینی اسلامک جہاد اور حماس سکولوں میں اور مسجدوں میں بڑی متحرک ہیں۔اس کے علاوہ وہ غریبوں کی معاشرتی اور معاشی امداد کرتی ہیں لیکن بچوں کی مکمل مذہبی تربیت کے لیے ان کا اپنا کوئی مذہبی سکول نہیں ہے۔ فلسطینی اسلامی جہاد، حماس اور حزب اللہ کا نظریاتی ڈھانچہ اگر چہ اسلامی لباس میں ملبوس ہے لیکن وہ بنیادی طور پر قوم پرست ہیں اور ان کی توجہ اسرائیل کے خلاف جدوجہد پر مرکوز ہے۔مذہب ان کے عمل کے لیے کوئی راہنمائی فراہم کرنے سے زیادہ ایک لباس کی مانند ہے۔

حاصل کلام

جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں مذہبی انتہا پسندوں کے تنظیمی ڈھانچے کم وبیش ایک جیسے ہیں لیکن اپنے حالات اور عمل کے لیے محرکات کے اعتبار سے وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔مثلاً فلسطینی گروہوں کے لیے اسرائیلی قبضے کے خلاف جنگ سب سے زیادہ اہم ہے۔اس کے برعکس مصری گروہ بنیادی طور پر معاشرتی اصلاح اور حکومت کی داخلی پالیسیوں کو اہمیت دیتے ہیں۔ ہیں۔پاکستانی انتہا پسند متعدد وجوہات سے متحرک ہوتے ہیں جن میں کشمیر پر کنٹرول کرنے کی خواہش بھی شامل ہے۔

مسلم دنیا میں مذہبی انتہا پسندی کے ابھرنے کی کوئی ایک وجہ نہیں ہے۔لیکن شاید اب تک سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سیکولر جدت پسند عناصر مسلمان ملکوں میں بہتر حکومت بنانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔تمام مقررین اس بات پر متفق تھے کہ انتہا پسندی کا مقابلہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہاں پر بہتر جمہوری حکومتیں قائم کی جائیں اور لوگوں کو ان کے مذہبی عقائد کی وجہ سے خوف زدہ نہ کیا جائے۔ فلسطینی علاقوں میں مذہبی انتہا پسندوں کا اثر اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اسرائیل کے خلاف لڑائی جاری رہے گی۔ امن و امان قائم کرنے کی روایتی کوششیں انتہا پسندی کو ختم کرنے میں ناکام رہیں گی کیونکہ یہ کوئی مثبت متبادل حل پیش نہیں کرتیں جو کہ ان نو جوانوں کو متاثر کر سکے جو انتہا پسندوں کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں۔

انتہا پسندی میں اضافے کی ایک اور بڑی وجہ مسلم دنیا میں حکومتوں کی ناکامی ہے۔ جو گزشتہ صدی کے دوران سماجی، آبادیاتی اور معاشی حوالے سے تیز تر تبدیلیوں کے نتیجے میں سامنے آنے والے چیلنجز کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔ یہ محض کوئی اتفاق نہیں ہے کہ مثلاً پاکستان میں اکثر انتہا پسند گروہ درمیانے سائز کے